اترپردیش اردو اکادمی
उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी

سہ ماہی

اکادمی

اپریل - جون ۲۰۲۵

اُترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

اترپردیش اردو اکادمی

سہ ماہی

اکادمی مجلّہ

جلد نمبر ۲۲ اپریل-جون ۲۰۲۵ شمارہ نمبر ۴

ایڈیٹر : شوکت علی (سکریٹری)

معاون : ممتاز احمد (سپرنٹنڈنٹ)

رسالے کے مندرجات سے اترپردیش اردو اکادمی کا بہ ہر صورت متفق ہونا ضروری نہیں

زرسالانہ: پچاس روپے-/50 قیمت فی شمارہ : پندرہ روپے-/15

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

سکریٹری، اترپردیش اردو اکادمی

وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ۔226010، فون نمبر 0522-4022924

upurduakademi3@gmail.com

www.upurduakademi.in

شوکت علی، سکریٹری، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے میسرس اے۔ایس انٹر پرائزز، نبی نگر چکدادن پور، کاکوری، لکھنؤ سے چھپوا کر اکادمی کے دفتر واقع وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ-226010 سے شائع کیا۔

ترتیب

اداریہ — ایڈیٹر — ۳

نواب سید محمد آزاد- حیات وفن

ڈاکٹر سید صابر حسن — ۵

مرزا عباس بیگ محشرؔ بنارسی

وسیم حیدر ہاشمی — ۱۹

نورالحسنین کی افسانہ نگاری کا تنقیدی تجزیہ

ابراہیم اعظمی — ۳۲

اعظم کُریوی: حیات اور شخصیت

ڈاکٹر جہاں گیر حسن — ۴۵

❖❖❖

اداریہ

اردو زبان و ادب کی آبیاری میں جن قلمکاروں نے اپنی خدمات انجام دی ہیں انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ کچھ قلمکاروں پر بہت کچھ لکھا گیا۔ آج بھی تحقیقات ہو رہی ہیں لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ بعض بلند قامت شخصیات پر یا تو کچھ لکھا ہی نہیں گیا یا بہت کم کام ہوا ہے۔ یونیورسٹیوں میں بھی انھیں شخصیات یا اصناف پر تحقیق ہو رہی ہے جن پر بہت کچھ تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ کاش یونیورسٹیز کے شعبہ اردو سے متعلق اساتذہ ان ادیبوں اور شعراء پر ریسرچ کراتے جن کی خدمات کو ایک طریقہ سے فراموش کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ میری اس گزارش پر اہل قلم حضرات غور و فکر کریں گے۔ اتر پردیش اردو اکادمی اپنے رسائل ماہنامہ خبر نامہ، سہ ماہی اکادمی اور باغیچہ میں اس بات کا خیال رکھتی ہے کہ ایسے ادیبوں اور قلمکاروں سے متعلق مضامین اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔ ساتھ ہی نئے قلمکاروں کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی رسالے کو شائع کرنے کے پیچھے اس ادارہ کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اکادمی اپنے فرائض کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ اس لئے قلمکاروں سے گزارش ہے کہ خاص طور سے سہ ماہی اکادمی میں ایسے تحقیقی و تنقیدی مضامین ارسال کرنے کی کوشش کی جائے جس سے نئی نسل کی معلومات میں اضافہ ہو سکے اور ان ادیبوں کی خدمات کا پتہ لگ سکے۔

اس شمارے میں اس بات کا خیال کیا گیا ہے اور ان شخصیات پر مضامین شامل کئے گئے ہیں جنھوں نے اردو کی ترقی و ترویج میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اکادمی کی فہرست دیکھنے کے بعد آپ کو خود اس بات کا احساس ہوگا کہ ان شخصیات پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ مشمولات میں پہلا مضمون ڈاکٹر سید صابر حسن صاحب کا ہے جنھوں نے 'نواب سید محمد آزاد: حیات و فن' پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ سید محمد آزاد کی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ 'خیالات آزاد'

'سوانح عمری آزاد' 'نوابی دربار' وغیرہ۔ سہ ماہی اکادمی کے اس شمارہ میں ان پر شائع مضمون کا مطالعہ کرنے پر قارئین کی معلومات میں مزید اضافہ ہوگا۔ ایسا میرا اپنا خیال ہے۔

دوسرا مضمون وسیم حیدر ہاشمی صاحب کا ہے جس کا عنوان مرزا عباس بیگ محشر بنارسی ہے۔ یہ محشر بنارسی کی حیات اور کارناموں پر ایک تحقیقی مضمون ہے۔ پروفیسر عشرت صاحب کی یادداشت کے سہارے اس مضمون میں بڑی اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ان کی زندگی کے نشیب و فراز کی عکاسی ان کی شاعری میں ہے۔

تیسرا مضمون نورالحسنین کی افسانہ نگاری پر ابراہیم اعظمی صاحب نے تحریر کیا ہے۔ نورالحسنین کا نام محتاج تعارف نہیں۔ فکشن کی تاریخ میں ان کا نام بڑے افسانہ لگاروں میں گردانا جاتا ہے۔ مضمون نگار نے ان کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ لینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

چوتھا مضمون 'اعظم کُریوی: حیات اور شخصیت' پر لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر جہانگیر حسن نے اس شخصیت کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور اعظم کُریوی کی حیات سے متعلق بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ خاندانی نسب نامہ، عہد طفولیت اور پرورش، حصول تعلیم، عہد ملازمت، وفات، شخص و عکس ادبی خدمات، حب الوطنی، تحریکات آزادی سے وابستگی جیسے گوشوں پر اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ اس مضمون میں آپ کو پڑھنے کو ملے گا کہ کس طرح ایک بچہ جس کا بچپن ناز و نعم میں گزرا لیکن جیسے جیسے وہ باشعور ہوتا گیا وہ اتنا ہی بااصول ہوتا گیا۔ اس کے دل میں وطن کی ایسی محبت پیدا ہوئی کہ انگریزوں کی نوکری میں رہتے ہوئے بھی کبھی ان کو عزت نہ دے سکا جس کا اسے خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ تمام پریشانیوں سے دوچار ہونے کے باوجود کبھی اس کا حوصلہ پست نہیں ہوا اور نامساعد حالت میں بھی وہ ادب کی خدمت کرتا رہا۔

مجھے امید ہے کہ قارئین اس شمارے کے مضامین سے مستفید ہوں گے۔

شوکت علی

ایڈیٹر

ڈاکٹر جہاں گیر حسن
کوشامبی

اعظم کُریوی: حیات اور شخصیت

اصل نام انصار احمد اور قلمی نام اعظم کُریوی ہے۔ اِس میں 'اعظم' تخلص اور 'کُریوی' آبائی گاوں 'کُرئی' کی طرف منسوب ہے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اُستاذ نوح ناروی نے اُن سے پوچھا: اعظم! یہ تم اپنے نام کے ساتھ ''کُریوی'' کیوں لکھتے ہو؟ اعظم کُریوی نے جواب دیا: اُستاذ! بالکل اُسی طرح جیسے آپ اپنے قصبے 'نارہ' کی مناسبت سے 'ناروی' لکھتے ہیں۔ اُستاذ! ایک دن آئے گا جب 'کُرئی' دور-دور تک مشہور ہوگا۔ اُن کی یہ پیشین گوئی صد فیصد دُرست ثابت ہوئی کہ آج 'اعظم کُریوی' ایک دمدار ستارے کی مانند فکشن کی دنیا میں چمک دمک رہے ہیں۔

تاریخ پیدائش: اعظم کُریوی 1899ء میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن کورئی ہے جو پرگنہ (تحصیل) چائل، ضلع الہ آباد، اتر پردیش میں واقع ہے۔ کورئی، بوڑھی گنگا کے کنارے ایک خوب صورت گھاٹ تھا جہاں بمشکل ساٹھ (60) گھر بستے تھے۔ آج بھی یہ گاؤں، بوڑھی گنگا کے کنارے واقع ہے۔ البتہ تعلیم و تعلّم کے اعتبار سے آج کل اِس گاؤں کی حیثیت پہلے جیسی نہیں رہی۔ ماہنامہ ''اخبار اعظم، اعظم نمبر'' میں 22 جون 1898ء سال و تاریخ پیدائش ہے اور مدت ملازمت میں دو سال کی توسیع کے لیے جس سرٹیفکیٹ کو درخواست کے ساتھ منسلک کیا تھا اُس میں 16 دسمبر 1901ء مندرج ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو تاریخ و

سال کے سلسلے میں حتمی طور پر کچھ کہنا بڑا مشکل ہے۔لیکن چوں کہ اعظم کُریوی نے بذات خود اپنا سال پیدائش 1899ء درج کیا ہے، لہٰذا ہمارے نزدیک یہی زیادہ قرین قیاس اور درست معلوم ہوتا ہے۔بایں سبب 1899ء کو ہی ہم نے لائق اعتبار اور درست تسلیم کیا ہے۔

آباواَجداد کے نام: 'فیاض احمد' والدمکرم ہیں۔'قادربخش' جداَمجد ہیں۔جبکہ اسرار اَحمد اورمحمد احمد دونوں بالترتیب چھوٹے بھائی ہیں۔اعظم کُریوی اُن میں سب سے بڑے ہیں۔ 1947ء سانحے کے شکار اعظم کُریوی بھی ہوئے اور باوجودیکہ والدین سے بڑی محبت کرتے تھے برادراوسط اَسرار احمد کے ساتھ پاکستان ہجرت کر گئے۔اس کے برعکس والدمکرم فیاض احمد اَور برادراصغر محمد احمد نے ہندوستان میں رہنا پسند کیا۔اِس طرح اُنھیں دوسانحوں سے دوچار ہونا۔ایک والدین کے سایۂ عاطفت سے محرومی اور ایک آبائی وطن کی دردناک جدائی۔اعظم کُریوی کووَالدین کریمین سے کس قدر محبت تھی،اس کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب بھی اُس کے پاس والدین کا کوئی خط آتا،تو وہ اُسے پڑھنے کے بعد اَپنے بچوں کو دیتے اور کہتے: بیٹا! ''اِسے چومو، یہ تمہارے دادا-دَادی کا خط ہے۔''اعظم کُریوی اپنی اولاد کو برابر کہتے رہتے تھے کہ''میرا کہابیشک ایک دفعہ ٹال جانا مگر ماں کو کچھ نہ کہنا۔''اعظم اپنے ماں-باپ سے متعلق بہت ہی Touchy واقع ہوئے تھے۔وہ سب کچھ سن لیتے تھے اور برادشت بھی کر لیتے تھے لیکن اپنی ماں کے بارے میں بالخصوص وہ کچھ نہیں سن سکتے تھے۔

خاندانی نسب نامہ: مشربی سلاسل میں قادریہ، چشتیہ،نقشبندیہ کی طرح سہروردیہ ایک اہم سلسلہ ہے۔اس کے بانی عارف باللہ شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ ہیں۔ اِس خاندان کے مورث اعلیٰ شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی کا مزار مبارک ملتان (پاکستان) میں زیارت گاہِ ہرخاص وعام ہے۔اعظم کُریوی کا تعلق اسی خانوادہ سے ہے۔

عہدطفولیت اور پرورش: اعظم کُریوی کے والد فیاض احمد علاقے کے بڑے زمیندار تھے

اِس لیے اُن کا بچپن بڑی خوش حالی اور بے فکری میں بسر ہوا۔ چوں کہ کورئی کے ایک طرف دریائے گنگا واقع تھا اور ایک طرف کھیت-کھلیان کی صاف وشفاف اور سرسبز فضائیں، اِس لیے اعظم کُریوی نے سیپیاں چننے کا بھی لطف اُٹھایا اور سیر وتفریح اور اُچھلنے کودنے کا بھی مزہ لیا۔ شاید اِسی خوشحالی اور بے فکری نے اُن کی طبیعت میں صفت ضد کا عنصر غالب کر دیا تھا۔ کیوں کہ اُن کے والد فیاض احمد جب کہیں باہر جاتے تو اعظم کُریوی زبردست چیخ وپکار مچاتے اور زمین لوٹ لوٹ جاتے کہ ہم بھی ہمراہ چلیں گے۔ چناں چہ انھوں نے اس کا یہ حل نکالا کہ کہیں جانے سے دو تین گھنٹے پہلے باغ میں گھوڑی، کاٹھی اور چارہ وغیرہ بھجوا دیا کرتے تا کہ اعظم کو اُن کے نکلنے کا پتا نہ چل سکے۔

حصول تعلیم: چوں کہ گھرانا شریف ونجیب اور تعلیم یافتہ تھا اِس لیے اعظم کریوی کی تعلیم و تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ تعلیم کی ابتدا گاؤں ہی سے ہوئی اور پھر مزید تعلیم کے لیے شہر کا رُخ کرنا پڑا۔ لہٰذا حصول تعلیم کی غرض سے اپنے ماموں احتشام الدین کے پاس جو سہارن پور گئیجہاں وہ پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے، وہاں اعظم کا داخلہ ایک اسکول میں کرایا گیا۔ اِسی درمیان چندن نامی ایک پنڈت لڑکی سے محبت کا رشتہ اُستوار ہو گیا۔ جب اس کا شہرہ اہل خانہ تک پہنچا تو چندن کا اسکول جانا بند ہو گیا اور اِس کے باعث ماموں کی طرف سے اعظم کو بھی بہت کچھ سخت وسست سننا پڑا۔ کچھ عرصہ بعد اِحتشام الدین کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا تو اعظم بھی اپنے ماموں کے ساتھ علی گڑھ پہنچ گئے۔ لیکن ابھی چند ہی دن ہوئے تھے کہ الہ آباد لوٹ گئے اور آگے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اعظم کا داخلہ بورڈنگ اسکول میں کرا دیا گیا۔ الہ آباد ہی میں انٹر پاس کیا اور ایف. اے میں داخلہ لیا لیکن ابھی ایف. اے کورس کا دوسرا سال ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا اور ملازمت کی طرف مائل ہو گئے۔

عہد ملازمت: آثار وقرائن بتاتے ہیں کہ اعظم کریوی نے اپنی ملازمت کا آغاز کلرک سے کیا۔ اولین دفعہ وہ سہارن پور کے ایک سرکاری دفتر میں بحیثیت کلرک ملازم ہوئے۔ یہاں ایک

بار پھر چندن سے ملاقات ہوئی اور پُرانی یادیں تازہ کیا ہوئیں کہ محبت آمیز خط و کتابت کا دور شروع ہوگیا۔لیکن جب اِس معاشقے کی بات چندن کے قریبی رشتے داروں تک پہنچی تو وہ اعظم کے جانی دشمن ہوگئے۔1916ء میں میرٹھ چلے گئے اور 1920ء تک وہاں قیام پذیر رہے اور میرٹھ سے ہی سال 1919ء میں اُن کے رومانی خطوط پر مشتمل ایک مجموعہ ''پریم پتر'' کے نام سے شائع ہوا۔اِس کے بعد الہ آباد واپسی ہوئی اور یکم ستمبر 1921ء کو الہ آباد کے ایک فوجی ادارے میں عارضی سویلین کلرک کے طور پر بحال ہوئے۔18 مئی 1922ء کو مستقل کلرک بنائے گئے اور 18 اکتوبر 1926ء تک الہ آباد میں ہی رہے۔

یہی وہ زمانہ ہے کہ اعظم کریوی 'ماہنامہ طوفان' الہ آباد کے ادارتی بورڈ سے منسلک ہوئے اور نوح ناروی کی سرپرستی میں نکلنے والے اِس ماہنامے کے مدیر قرار پائے اور اِسی میں اُن کا پہلا افسانہ ''پریم کی انگوٹھی'' شائع ہوا۔الہ آباد سے تبادلہ ہوا تو کوئٹہ چلے گئے اور 19 اکتوبر 1926ء سے 19 اکتوبر 1928ء تقریباً دو سال تک جبل پور میں تعینات رہے۔اِس کے بعد بھی مختلف مقامات پر تبادلہ ہوتا رہا۔لیکن ایک بار پھر میرٹھ جا پہنچے اور 12 اپریل 1941ء سے 22 دسمبر 1942ء تک ہیڈ کوارٹر میرٹھ ڈسٹرکٹ کے ویٹنری برانچ کے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر مامور ہوئے اور اِس درمیان کچھ دنوں کے لیے ''دہرہ دون'' میں بھی تعینات رہے۔اعظم کریوی کے لیے 1928-1942ء کا زمانہ تحریر و تالیف کے لحاظ سے بڑا زرخیز معلوم ہوتا ہے، مثلاً: زمانہ، نگار، الناظر، عصمت، مخزن، ہمایوں وغیرہ مشہور و معروف رسائل میں اعظم کے افسانے شائع ہوئے۔اُن کی مختلف کتابیں منظر عام آتی ہیں، مثلاً: ایک کتاب 'ہندی شاعری' 1931ء میں کتابستان، الہ آباد سے شائع ہوئی اور ایک کتاب ''دیہاتی گیت'' 1939ء میں ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد سے شائع کی گئی۔جبکہ اُن کا اولین افسانوی مجموعہ ''پریم کی چوڑیاں'' 1942ء میں شائع

> ''دکھیا کی کہانی میری زبانی کے عنوان سے ایک سلسلہ وار کہانی ماہنامہ ''عصمت'' کراچی کیلئے شروع کی تھی لیکن زندگی نے وفا نہیں کی''

ہوا۔ اِس زمانے میں اعظم کریوی رسالہ ''اکبر'' کے شعبۂ ادارت سے بھی منسلک رہے۔

اس کے بعد سال 1943-1942ء میں چھ-سات مہینے کے لیے بنگال میں تعینات رہے، پھر اَنبالہ چلے گئے اور 1943ء سے 23 نومبر 1947ء تک انبالہ رسباتھو میں رہے۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ کافی جدوجہد اور عمل پیہم کے بعد ہندوستان کو آزادی ملی اور تشکیل پاکستان عمل میں آئی۔

1924-1947ء کا عہد افسانہ نگاری کے اعتبار سے انقلابی ثابت ہوا۔ اِس دوران ان کے تقریباً چھ افسانوی مجموعے منظر عام آئے۔ مثال کے طور پر ''شیخ و برہمن'' اور ''دکھ سکھ'' یہ دونوں مجموعے 1943ء میں، ''انقلاب'' اور ''کنول'' یہ دونوں مجموعے 1944ء میں، ''ہندوستانی افسانے'' اور ''روپ سنگھار'' یہ دونوں مجموعے 1945ء میں یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔

تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے، وہیں سرگودھا میں ملازم بحال ہوئے۔ پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد اعظم کریوی کی افسانہ نگاری میں کمی آ گئی تھی اور فقط چند گنے چنے افسانے ہی لکھ پائے۔ اُن میں ایک افسانہ ''مہاجر کی عید'' اور ایک کہانی کا سلسلہ ''دکھیا کی کہانی میری زبانی'' قابل ذکر ہے۔ ''دکھیا کی کہانی میری زبانی'' کے عنوان سے سلسلہ وار کہانی ماہنامہ ''عصمت'' کراچی کیلئے شروع کی تھی لیکن زندگی نے وفا نہیں کی اور مذکورہ کہانی کا یہ سلسلہ پانچ کے عدد پر ہی رُک گیا، جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

وفات: اعظم کُریوی نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں۔ اعظم کریوی جو کبھی انتہائی عیش و عشرت کی زندگی بسر چکے تھے آخری عمر میں اُنھیں کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اُن کی پیشانی ذرہ برابر بھی شکن آلود نہیں ہوئی۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ایک بار پھر کہانی لکھنے کی طرف مائل ہوئے اور سچی کہانی پر مشتمل سلسلہ 'دکھیا کی کہانی' کے نام شروع کیا اور ابھی اُس کے غالباً چار پانچ سلسلے ہی شائع ہوئے تھے کہ اُسی کہانی کے سبب جان لیوا حملہ ہوا اور 1955ء میں اس دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔

شخص و عکس: اعظم کریوی کے اوراق حیات پلٹنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اعظم کی شخصیت تضادات کا مجموعہ ہے۔ ایک طرف احباب و متعلقین اُنھیں تیز مزاج، غصیلے، کھردری طبیعت کا مالک بتاتے ہیں تو دوسری طرف اصدقا اُنھیں نازک مزاج، زندہ دل، بذلہ سنج، ہمدرد اور دوست نواز شخصیت کہتے ہیں۔ برادر اوسط اسرار احمد کریوی اپنے مضمون ''ذکر اعظم کریوی'' میں لکھتے ہیں کہ ضدی طبیعت پائی تھی اور تیز غصہ والے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے غصے کی تیزی کے باعث انگریز وغیرہ کو گالی دینے اور انگریز افسروں کو پیٹنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ بایں سبب وہ ترقی نہ کر سکے جب کہ اعظم کے ساتھی نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ فوج میں اُن کی ترقی نہ ہونے کی وجہ صرف اُن کا غصہ تھا۔ اس کے برعکس ایک مراسلہ جو اعظم کریوی نے 1934ء کے اخیر میں ''نیرنگ خیال'' لاہور کے ایڈیٹر کو لکھا تھا اُس کے بموجب: اعظم بڑے نازک مزاج اور جذباتی معلوم ہوتے ہیں۔ مراسلہ میں درج ہے کہ شور وغل سے بہت گھبراتا ہوں۔ دل پر کسی خاص واقعہ یا نظارہ کا اثر ہوا کہ میں تنہائی میں افسانہ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں، اس عالم میں اگر میرے کسی کرم فرمانے پکارا، یا میرے بچوں نے شور مچایا تو پھر لاکھ کوشش کرنے پر بھی اس وقت اپنے افسانے کو مکمل نہیں کر سکتا۔ چناں چہ اس نقص کی وجہ سے سال میں دو چار ہی اوریجنل افسانے لکھ پاتا ہوں۔

اعظم کُریوی اپنے والدین کے بڑے چہیتے، لاڈلے اور پیارے تھے، اور اِس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اِس سے پیشتر فیاض احمد کی جو بھی اولاد ہوئیں وہ زندہ نہیں رہ سکیں۔ وہ اقربا پروری اور انسان دوستی کی مثال تھے۔ اپنے عزیز و اقارب سے اُنھیں بڑی محبت تھی۔ گاؤں کے غرباء سے خلوص کے ساتھ ملتے تھے اور لوگوں سے بلاتفریق ذات، برادری و مذہب بڑی عزت کرتے تھے۔ لیکن اُن کی شخصیت کا یہ پہلو بڑا ہی حیرت انگیز ہے کہ وہ اپنے اعزہ و اقارب کی عزت کرنے اور اُن سے حد درجہ محبت رکھنے کے باوجود اَپنے بیٹوں کو رِشتے داروں سے دوری بنائے رکھنے کی تاکید و تلقین کرتے تھے۔ بقول افتخار احمد: والد صاحب مجھ کو سمجھاتے تھے کہ رشتے داروں سے اور خاندان والوں سے کوئی تعلق نہ رکھنا، خاندان میں

رشتہ دینا نہ رشتہ لینا۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ وہ دادا کے علاوہ کسی سے نہیں ملاتے تھے اور اِس کی خاص وجہ یہ تھی کہ اعظم کریوی اپنے خاندان والوں سے اُن کی بعض غلط حرکات کے باعث بدظن تھے، کیوں کہ والد صاحب کا کہنا تھا کہ رشتے دار دھوکے باز ہیں۔ اُنھوں نے جعلی شجرے بنائے۔ یہ اپنے کو مقید کرنا ہے اور یہ اسلامی تعلیمات کے بھی خلاف ہے، لیکن اِن سب باتوں کے باوجود خاندان کے بڑوں کی عزت اور اُن سے محبت رکھنے پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی وہ اپنے خاندان کے بڑوں کی عزت اور اُن سے محبت کرتے رہے۔ پھر رہ گئی یہ بات کہ اپنے بچوں کو اُن سے دوری بنائے رکھنے کی تاکید و تلقین کی تو میرے خیال میں اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

1- اہل خاندان کی غلط حرکتوں کے سبب اُن کے بچوں کو کوئی نقصان نہ ہو۔ 2۔ اُن کے بچے خاندان والوں کی بے عزتی نہ کردیں۔ 3۔ یا وہ رسم ورواج توڑنا چاہتے تھے جو خاندان والوں نے اپنا رکھا تھا کہ شادی بیاہ خاندان سے باہر نہیں ہونی چاہیے۔ کیوں کہ وہ خاندانی حد بندیوں پر یقین نہیں رکھتے تھے، اُنھوں نے بعد میں جو تین شادیاں کیں وہ بھی خاندان سے باہر ہی کی تھیں۔

جناب ضمیر جعفری جو 1953ء میں ''مورال بلڈنگ محکمے'' کے تحت ملازمت کے دوران ساتھ رہے، وہ ڈاکٹر اعظم کُریوی سے بہت متاثر تھے اور اُن کی پرکشش اور اِنسان دوست شخصیت سے کافی مرعوب و متحیر بھی تھے۔ اپنے مضمون ''ڈاکٹر اعظم کُریوی کے ساتھ دو سال'' میں وہ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر اعظم کریوی کی شخصیت اور کردار کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا چاہوں تو وہ لفظ ہے ''حیرت انگیز''۔ کیوں کہ اُن کی زندگی کا جو بھی گوشہ سامنے آیا اُسے حیرت انگیز پایا۔ 1951ء میں ملیر کینٹ کے محکمہ ''مورال بلڈنگ'' میں اُن کا تقرر ہوا تو حفیظ جالندھری کے توسط سے اُنھیں پہلی بار دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی۔ دفتر میں تو دونوں ساتھ ساتھ رہتے ہی تھے، رہائش بھی پاس پاس ہونے کی وجہ سے جلد ہی ہم دونوں میں کافی اخلاص پیدا ہوگیا۔ دفتر اور گھر قریب قریب تھا اِس لیے بسا اوقات ہم لوگ شام کا کھانا بھی

دفتر ہی میں منگوالیا کرتے تھے۔محکمانہ تعلقات بہت جلد دوستانہ محبت میں ڈھل گئے۔ہم لوگ کسی مشترکہ دفتر کے کارکنان سے زیادہ دکھ سکھ کے شریک اور ایک کنبے کے افراد معلوم ہوتے تھے۔دفتر سے اُٹھتے تو حفیظ جالندھری کے یہاں جا بیٹھتے اور ظاہر سی بات ہے کہ اس حالت وکیفیت میں ڈاکٹر صاحب سے بے تکلف ہوئے بغیر میرے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔اگر کبھی عمر میں فرق کے باعث میں کچھ فاصلہ قائم کرنے کی کوشش بھی کرتا تو وہ آگے بڑھ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیتے۔حجاب وتکلف کے وہ سخت مخالف تھے۔دفتر میں مجھ سے پہلے ہی روز کہنے لگے کہ میں تو آپ کو بھائی کہا کروں گا اور فی الحقیقت میرے ساتھ اُن کا سلوک ہمیشہ بڑے بھائی کا سا رہا۔

اعظم کُریوی کے مزاج وشخصیت سے متعلق اپنے ایک مکتوب بنام حامد کمال ناروی میں ضمیر جعفری لکھتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں دو بیویوں والے کو اِتنا بذلہ گفتار اور اِتنا بے فکرا کسی کو اَور کبھی نہیں دیکھا۔شاہد احمد دہلوی اپنا مجموعی تاثر یوں دیتے ہیں کہ اعظم کریوی ایک عجیب وغریب انسان تھے۔

اعظم کریوی نے کچھ دنوں تک لکھنو میں بھی قیام کیا جہاں اُن کی ملاقات ڈاکٹر عبادت بریلوی سے ہوئی۔ اِس ملاقات میں اُنھوں نے اُن کو کیسا پایا، اپنے ایک مکتوب بنام حامد کمال ناروی میں لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر اعظم کریوی کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ایک زمانے میں لکھنؤ تشریف لائے تھے اور چند ماہ اُن کے ساتھ میں نے گزارے لیکن ان کی شخصیت بہت عجیب تھی، اتنی عجیب کہ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔اُن سے میری ملاقاتیں رہیں لیکن اب میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیسے آدمی تھے۔میں نے ہمیشہ اُنھیں اچھا دوست پایا۔دانش محل میں روزانہ تشریف لاتے تھے اور اُن سے روزانہ ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ڈاکٹر اعظم کُریوی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی نہایت محنت، مستعدی اور ایمانداری سے اپنی ذمے داری ادا کرتے تھے۔مختلف النوع مصائب ومسائل میں گھرے ہونے کے باوجود اُنھوں نے کبھی بھی اپنے فرائض منصبی سے

سمجھوتہ نہیں کیا اور نہ اپنے معمولات میں کبھی کوئی رُکاوٹ آنے دی۔ ریٹائر ہونے سے چند سال پہلے اخراجات کی کثرت اور وسائل کی کمی سے ہجوم افکار نے اعظم کریوی کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ وہ پہلے کی طرح اب تنومند تو نہیں تھے لیکن ان کے حوصلے پوری طرح پست نہیں ہو سکے تھے اور اُن کی فرض شناسی اور فرض کی ادائیگی متاثر نہیں ہو سکی تھی۔ معمولات کے اتنے بڑے پابند تھے کہ ایسے انسان میں نے اپنی زندگی میں بہت کم دیکھے ہیں۔ احساس فرض کا جذبہ اس قدر شدید تھا کہ ان کی زندگی ایک سزا با مشقت معلوم ہوتی۔ پاسبان عقل ہر وقت دل پر مسلط۔ 1951ء میں وہ پنشن کی حد پر جا پہنچے تھے۔ زندگی کچھ اس بیدردی سے ان کے اوپر سے گزری تھی کہ وہ اپنی عمر سے بھی کوئی پندرہ برس زیادہ معمر نظر آتے تھے۔ رخسار پچک گئے تھے۔ ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ دبلے پتلے، لاغر و کمزور، آنکھیں اندر کو کہیں اتنی دور چلی گئی تھیں کہ چہرے پر ناک ہی ناک رہ گئی تھی۔ مگر اِس کے باوجود بلا کے مستعد تھے۔ غضب کے چوکس و چوبند اور کارفرما و کارکشا۔ دیکھنے میں وہ تکان کا مجسمہ دکھائی دیتے تھے مگر تھکنا وہ جانتے ہی نہ تھے۔ وہ اس مقام پر تھے جہاں تکان خود تھک کر بیٹھ جاتی ہے۔ اُن کی گھریلو زندگی کا پھیلاؤ اُن کے وسائل و آمدنی کے بس کا روگ نہ تھا۔ معاملات الجھے ہوئے بھی تھے مگر یہ ناممکن تھا کہ محض ان کی کاہلی یا بے پروائی کے سبب کوئی معاملہ اُلجھنے پائے یا دیر تک الجھا رہے۔ جس وقت اُن کو جس مقام پر ہونا چاہیے وہ وہاں ضرور ہوتے۔ اور ایسے عالم میں اگر اُن کا کوئی سچا ہمدرد و غمگسار تھا تو وہ تھی اُن کی بوسیدہ سی بائیسکل، جو زندگی کی تمام مشکلات میں اُن کے ساتھ ساتھ رہی اور تمام طرح کے فرائض منصبی کی ادائیگی میں اُن کی مدد کرتی رہی۔ اپنی تمام تر ذمے داریاں اور گھریلو کام کاج اسی بائیسکل پر سرانجام دیتے تھے اور بائیسکل بھی اسی طرح چلاتے تھے جیسے کوئی بیمار گھوڑا لدا ہوا تانگہ گھسیٹ رہا ہو۔

گویا اعظم کُریوی کی حیات کا ابتدائی دور جس قدر آسودہ حالی میں بسر ہوا، اس کے برعکس اُن کی زندگی کا آخری دور کسمپرسی اور تنگ حالی میں گزرا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے بچپنے میں گھوڑی اور کاٹھی کی شاہی سواری کا لطف اُٹھایا تو ضعیفی

میں اُنھیں ٹوٹی پھوٹی اور کھٹارا بائیسکل کی رفاقت برداشت کرنی پڑی۔ وہ خود کو مصروف رکھنے میں یقین رکھتے تھے اور خالی بیٹھنا اُنھیں سخت ناگوار تھا۔ بقول ضمیر جعفری 'ملیر سے ڈیوٹی ٹرک لے کر ہم لوگ جب کبھی کراچی جاتے تو اعظم اپنی بائیسکل بھی اُسی میں رکھ لیتے، جہاں ٹرک نہ جاسکتا وہاں وہ بائیسکل پر ہوآتے۔ بازار میں اچھے بھلے چلتے چلتے اچانک معذرت کر کے یکبارگی غائب ہوجاتے۔ پھر اللہ معلوم کہاں کا چکر کاٹ کر اچانک کسی موڑ پر آن ملتے۔ گویا ابھی تھے ابھی نہیں ہیں۔ آرام اُن کی سرشت ہی میں نہ تھا۔ دوستوں کی بے تکلف صحبتوں میں ان کی گفتگو پر بھی مشقت کا گمان ہوتا۔ اعظم کو میں نے آرام سے فارغ بیٹھا کبھی نہ دیکھا۔ بعض اوقات گمان ہوتا کہ فارغ بیٹھنے سے اُنھیں شدید تکلیف ہوتی تھی۔ دفتر تو خیر دفتر تھا، گھر پر بھی جب ملے تو ہمیشہ مصروف ملے، کبھی چارپائی کا بان ادھیڑ رکھا ہے۔ کبھی دھوتی باندھے گھر کی صفائی میں جٹے ہیں۔ کبھی نواسے، نواسوں کے حلقے میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ کچھ نہیں کر رہے ہیں تو بائیسکل پر چڑھے کسی طرف ہی چلے جا رہے ہیں۔' اُن کے پاس گھریلو ذمہ داریوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی ایک لمبی لسٹ ہوتی تھی اور کب کیا انجام دینا ہے وہ سب اُن کی ٹیبل ڈائری میں مندرج رہا کرتے تھے۔ پھر بھی وہ بڑے اطمینان وسکون سے اپنے کام میں مصروف رہتے اور بڑی سے بڑی ذمہ داری کو بھی اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتے۔ گویا اعظم کُریوی کی شخصیت ایک ایسے مضبوط مجسمے کی طرح تھی جو بادِ باراں کی تند یورشوں کو خاطر میں نہیں لاتی اور اپنی جگہ اٹل رہتی ہے۔

بحیثیت سوشل ورکر: چوں کہ اعظم کُریوی کا آخری زمانہ کسمپرسی اور کلفت میں گزرا اِس لیے وہ سامنے والے کا دکھ درد بخوبی سمجھتے تھے۔ بنابریں دوسروں کے دکھ- درد میں کام آنا وہ اپنا فرض منصبی جانتے تھے، اور پیرانہ سالی میں لوگ عام طور پر آرام طلب واقع ہوتے ہیں بلکہ ایک گلاس پانی کے لیے بھی کسی نہ کسی کی مدد کے طالب ہوتے ہیں، لیکن اعظم کی شخصیت اِس اعتبار سے منفرد اور قابل رشک نظر آتی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے گھریلو کام- کاج بذات خود کرنے میں فرحت و اِنبساط محسوس کرتے تھے بلکہ دوسرں کے کام آنے میں بھی

اُنھیں یک گونہ فرحت وسرور کا احساس ہوتا تھا۔ وہ اکثر آتے جاتے اپنے آس- پاس والوں سے پوچھتے کہ کسی کو کچھ منگانا تو نہیں ہے؟ یہاں تک کہ کبھی کبھی تو پڑوس کے کچرے بھی خوشی خوشی باہر پھینک آتے تھے۔ یہاں تک کہ نماز کے لیے جاتے ہوئے بھی وہ کچرا وغیرہ مانگ کر لے جاتے تھے۔ اور اِسی بس پر نہیں تھا بلکہ خانہ داری کے انتظام وانصرام میں اُن کی مشق ومہارت کا یہ عالم تھا کہ ازراہِ محبت اپنے ہم پیشہ ضمیر جعفری کے بعض گھریلو اِنتظامی اُمور بھی اُنھوں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔

یہی وہ انسانی جذبہ تھا جس نے اعظم کریوی کو کام، کام اور صرف کام میں مصروف کر رکھا تھا، ممکن ہے کہ وہ اس میں یقین رکھتے ہوں کہ ''زمین کے اوپر کام اور زمین کے نیچے آرام''۔ یہ گمان اس طور پر بھی یقین میں بدل جاتا ہے کہ اُنھوں نے جو بھی کام کیا وہ نہایت انہماک اور لگن کے ساتھ کیا، چاہے وہ گھریلو اُمور ہوں، چاہے انسانی جذبے کے تحت کوئی کام، یا پھر دفتری امور ہوں۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی تو دفتر کا وقت ختم ہو جاتا پھر بھی وہ دفتری کاموں میں مشغول رہتے اور بقایا کاموں کو نمٹاتے رہتے۔ یعنی دفتر کا وقت ختم ہو چکا ہوتا اور حفیظ صاحب آوازیں دے رہے ہوتے کہ ڈاکٹر صاحب آیئے! دن بھر کی محنت کے بعد اَب کچھ گپ شپ ہو جائے مگر وہ ہیں کہ اب نئے سرے سے دفتر کھول کر بیٹھ گئے ہیں۔ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتے: مرشد! مجھے ابھی معذور ہی سمجھئے، بہت کام بقایا پڑا ہے۔ آپ افسر سہی، محکمہ تو مجھی کو چلانا ہے۔ کام نہ ہوتا تو پیدا بھی کر لیتے، حفیظ صاحب دفتری ڈرافٹوں میں شعر کی جامعیت کے قائل تھے اور ڈاکٹر صاحب افسانوی پھیلاؤ کے، اُن کی کوشش ہوتی کہ ڈرافٹ مرزا غالب کی غزل ہو، اِن کی کوشش ہوتی کہ ڈرافٹ میں تمہید، پلاٹ، مرکزی خیال، نقطۂ عروج سب کچھ ہو۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ کام پیدا ہوتا رہتا۔ ایک دن آخر وہی ہوا جو ہونا تھا کہ اعظم کریوی کی صحت بگڑنے لگی، کیوں کہ قوت برداشت سے زیادہ کام کا اثر صحت پر تو پڑنا لازمی تھا، لہٰذا وہ چوطرفہ مسائل ومشکلات، مثلاً ضعف ونقاہت، کثرت کار، مالی پریشانی اور سیاسی افراتفری کے شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکے، لیکن ایسے عالم میں بھی انھوں

نے خود کو قابو میں رکھا اور حالات کی سنگینی کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے بجائے جہد مسلسل اور عمل پیہم کو اَپنا شعار بنائے رکھا۔ حالاں کہ اخیر سال میں صحت کمزور، آمدنی قلیل، تین چار کنبوں کی کفالت کے باعث اعظم کا رنگ مرنے سے پیشتر ہی زرد ہو چکا تھا۔ نہ جانے وہ زندگی کے کتنے محاذوں پر لڑ رَہے تھے مگر زندگی کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر ہرگز آمادہ نہ تھے۔ جس جس طرح کی مادّی وذہنی پریشانیوں میں گھرے ہوئے اُنھیں دیکھا گیا، اگر کوئی اور ہوتا تو مدتوں پہلے گھٹنے ٹیک دیتا مگر وہ برابر لڑتے جا رہے تھے۔ اوپر سے ہجرت اور مہاجر ہونے کے باعث اُن کی پریشانیوں میں اور اِضافہ ہوتا چلا گیا۔ اُس پر ملازمت سے سبکدوشی نے رہی سہی اُن کی کمر بھی توڑ دی اور وہ اَن چاہا مشکلات ومصائب میں گھرتے چلے گئے۔

بحیثیت انسان نواز: اِس سے قطع نظر کہ اعظم کُریوی بچپن میں ضدی اور غصہ ور طبیعت کے مالک تھے، جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی اُن کے اندر انسان دوستی اور احباب نوازی کا جذبہ بڑھتا گیا۔ چناں چہ جو کبھی بچوں کے شوروغوغا سے گھبرایا کرتے تھے اور کبھی کبھی بچوں کو اُن کی شرارتوں پر اُنھیں طمانچے بھی مار دیا کرتے تھے، ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ اُنھیں پوتوں اور نواسوں کے ساتھ وقت گزارنے لگے۔ پھر اُن کی یہ محبتیں اور شفقتیں صرف اپنوں تک ہی محدود نہیں رہیں بلکہ زندگی میں جو کوئی بھی ایک بار اُن سے مل لیا، یا اتفاقاً کسی سے کبھی کوئی ملاقات ہوگئی تو بھی اُس کو ہمیشہ یاد رکھتے اور جب دوبارہ اُس سے ملاقات ہوتی تو اُس کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے۔ شاہد احمد دہلوی مدیر ماہنامہ ''ساقی'' کراچی کے بقول: اتفاق سے اُن سے پہلی ملاقات میرٹھ کے نوچندی میں ہوئی۔ تعارف ہوتے ہی گلے سے لگایا کہ نہ جانے کب کے تر سے پھڑکے ہوئے تھے۔ پھر اُس پر سخت مصر کہ نہیں، ابھی میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ میرٹھ میں کہیں اور ٹھہرے ہی کیوں؟ بمشکل تمام انھیں اس پر رضامند کیا کہ کل دوپہر کو قافلہ آپ کے یہاں آئے گا اور خوب جی بھر کے باتیں ہوں گی۔ اگلے دن ہم ان کے گھر گئے تو ڈاکٹر صاحب خاطر ومدارات میں بچھے جاتے تھے اور بار بار شکوہ کرتے تھے کہ میرٹھ آپ آئیں اور کہیں اور ٹھہر جائیں؟ کئی گھنٹے اُن سے باتیں

ہوتی رہیں۔شام کی گاڑی سے ہمیں دہلی جانا تھا۔جب ہم چلنے لگے تو ڈاکٹر صاحب رنجیدہ ہوگئے اور اُس وقت تک ہمارا ساتھ نہ چھوڑا جب تک ہمارے تانگے روانہ نہیں ہوگئے۔ لوگوں سے راہ ورسم اور شناسائی پیدا کرنے میں بھی اعظم بڑے تیز واقع ہوئے تھے۔راہ چلتے چلتے،بس یا ٹرام میں بیٹھے بیٹھے،اجنبی لوگوں سے اچھی خاصی جان پہچان بنالیتے تھے۔ ٹیلیفون کرتے ہوئے کوئی غلط نمبر مل جاتا تو اکثر وبیشتر اس اتفاقیہ تقریب کو باقاعدہ تعارفی تقریب کے قالب میں ڈھال دیتے تھے اور کمال تو یہ تھا کہ ان لوگوں کو یاد بھی رکھتے تھے۔ البتہ! گہری دوستیاں قائم کرنے کی طاقت اُن میں نہ تھی لیکن جس کسی سے بھی اخلاص کا رشتہ ایک بار قائم ہوجاتا تو وہ دیدہ ودل اس کے سامنے فرش راہ کردیتے تھے۔حالاں کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اعظم کریوی سخت مالی بحران کا شکار تھے پھر بھی اُنھوں نے احباب نوازی سے منھ نہیں موڑا۔پُرانے تعلقات کے رکھ رکھاؤ،احترام اور وضع داری میں اپنی معذوریوں، مجبوریوں کو یکسر بھول جاتے تھے۔ایک مرتبہ کراچی سے اپنی سائیکل پر سوار واپس آئے اور کہنے لگے: بھائی صاحب! کل شام کا کھانا ہمارے یہاں کھایئے گا۔خیرت تو ہے؟ میں نے تعجب سے پوچھا۔معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ایک مشہور شاعر جو اِن دنوں کراچی آئے ہوئے تھے،اُنھیں کھانے پر مدعو کرآئے ہیں۔یہی نہیں بلکہ اُن کے ساتھ 15-20 دیگر اصحاب بھی، جو اُس وقت جناب شاعر کی خاطر داری میں مصروف تھے۔فرمایا: مجھے معلوم ہے کہ اس ایک دعوت کا لایا ہوا قحط مہینوں اب میرے گھر میں رہے گا مگر بھائی صاحب! مدت کے بعد اُن سے ملاقات ہوئی ہے۔ملنے چلا گیا تو اَب کیا کرتا... اُن سے کیا کہتا؟ گویا اعظم کریوی کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی آدمی اُن کے قریب رہے اور اُن کے اخلاص، اُن کے انکسار، اُن کی ہمدردی اور تعلقات میں اُن کی گرمجوشی سے متاثر نہ ہو پائے۔ وہ جس کسی کے قریب جانا چاہتے تو اِنتہائی کشادہ دلی سے اپنے آپ کو اُس کے سپرد کردیتے۔اُن کی شخصیت شہد اور موم کی بنی ہوئی تھی۔میں نے کبھی ایک سنگریزے کی کسک بھی اُن میں محسوس نہیں کی۔مزاج ایسا پایا تھا کہ اس مزاج کا آدمی جہاں کہیں بھی مل جائے تو اُسے اٹھا کر دفتر میں

رکھ لینا چاہیے، مثلاً: ملائم، متحمل اور معاملہ فہم۔ اِن تمام باتوں کے پیچھے اُن کی غیر معمولی ذہانت کارفرما تھی۔ وہ جب بھی کوئی رائے دیتے تو بڑے سلیقے سے دیتے۔ ضمیر جعفری بتاتے ہیں کہ معاملات پر اپنی ایک رائے بھی رکھتے، موقع محل دیکھ کر اُس کا اظہار بھی ضرور کرتے، مگر سب کچھ اِس سلیقے کے ساتھ کہ گویا اپنی کوئی رائے ہی نہیں۔ کوشش یہ ہوتی کہ ڈائریکٹر صاحب (حفیظ جالندھری) اُن کی رائے خود اپنی رائے سمجھ کر اُس پر عمل کریں۔ وہ اپنے نقطہ نظر کو واشگاف الفاظ میں بیان نہیں کرتے تھے، بلکہ افسر کو گھیر گھار کر اُس تک لے آتے تھے۔ اپنے کام کی اہمیت، اس کی مقدار و معیار پر روشنی ڈالنے کا ملکہ اُن میں وافر انداز میں تھا۔

اعظم کُریوی کی انسان دوستی کے شاہد وہ خطوط بھی ہیں جو اُنھوں نے اپنے احباب اور متعلقین کو لکھے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اُن کے خطوط، مجموعہ کی شکل نہ پا سکے اور اگر کچھ شائع بھی ہوئے تو اُنھیں قابل اعتنا نہ سمجھا گیا۔ مختلف مواقع پر شاہد احمد دہلوی اور اعظم کُریوی کے مابین مراسلاتی تعلقات قائم رہے، چناں چہ وہ بیان کرتے ہیں کہ اُن (اعظم کریوی) کے خطوط سے بڑی محبت ٹپکتی تھی۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً یوسف کمال ناروی کے نام بھی کئی خطوط لکھے جن سے اُن کی شخصیت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر 23 ستمبر 1944ء کے اپنے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں: والد صاحب، والدہ صاحبہ، محسن صاحب، مرشد، نور مرشد، ماسٹر صاحب، بڑے بابو کو سلام، بچوں کو پرخلوص دعائیں۔ 13 دسمبر 1944ء کو ایک دوسرے خط میں لکھا کہ میری بیگم آپ کو دعا کہتی ہیں۔ بچے سلام عرض کرتے ہیں۔ نمبر دار بحساب عمر بچوں کے نام سن لیجئے: افتخار احمد، زینت النساء، تہذیب النساء، نیر اعظم، نیر اعظم سب سے چھوٹے ہیں۔ قیصر و توصیف سلمہ کو بہت بہت دعائیں۔ ہاں! میں نے دریافت کیا تھا کہ والد صاحب کا جو تبادلہ کلکتہ ہو گیا تھا وہ منسوخ ہوا، یا نہیں؟ مگر آپ نے اب تک کوئی جواب نہیں دیا۔ میری طرف سے والدہ صاحبہ، والد صاحب، مرشد، محسن صاحب، نور جہاں، ماسٹر صاحب، بڑے بابو، ڈرائیور صاحب و جملہ پُرسان حال کو سلام۔ اِس طرح سے نام بنام سلام و دعائیں بھیجنا، یہاں تک کہ ڈرائیور کو بھی سلام، اعظم کُریوی کی

انسان دوستی کی واضح دلیل ہے۔

حب الوطنی: شاہد احمد دہلوی کے مطابق اعظم کُریوی نے عرصۂ دراز تک دیہات میں زندگی گزاری اور ڈاکٹر حامد کمال ناوری کا یہ کہنا کہ اعظم کُریوی زیادہ تر اپنے وطن سے باہر رَہے اور شہر میں اُن کا وقت زیادہ گزرا۔ اِن دونوں باتوں میں مطابقت تلاش کرنے کے بجائے یہاں یہ دیکھنا اہم ہے کہ اعظم کُریوی کو اپنے وطن اور گاؤں سے کس قدر محبت تھی اور اُنھیں علاقہ اور علاقہ کے باشندوں کا کس قدر خیال تھا؟ اب چاہے وہ دیہات میں زیادہ رہے ہوں یا شہر میں، بہرصورت اُنھیں اپنے وطن اور گاؤں سے حد درجہ محبت تھی۔ یہی وہ اصل وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے قلمی نام ''اعظم'' کے ساتھ اپنے گاؤں 'کُرئی' کی نسبت کے باعث 'کُریوی' لکھنا شروع کیا۔ اِس سے تعلق ایک مرتبہ شاعر نوح ناروی نے اعظم کریوی سے دریافت کیا: ''اعظم! اپنے نام کے ساتھ ''کُریوی'' کیوں لکھتے ہو؟ تو اُنھوں نے جواب دیا: اُستاذ! میں چاہتا ہوں کہ میرا گاؤں پوری دنیا میں مشہور ہو، اور ایک دن دیکھئے گا کہ میرے گاؤں کا نام پوری دنیا میں ضرور مشہور ہوگا۔'

اور آج اُن کا یہ کہنا سچ ثابت ہو رہا ہے کہ آج ایک معمولی گاؤں ''کرئی'' دنیا میں معروف ہے۔ نیز اِس میں دو رائے نہیں کہ اعظم کُریوی تعلیم و تعلّم یا پھر ملازمت کے سلسلے میں اپنے وطن سے باہر رہے، مگر وہ ہمہ دم اپنی وطن دوستی کا ثبوت فراہم کرتے رہے۔ مثلاً جب بھی وہ کچھ تحریر کرتے تو اُس تحریر کے آخر میں اپنے گاؤں کا نام ضرور لکھتے۔ چناں چہ جب ''ہندی شاعری'' کا دیباچہ لکھا تو اُس کے خاتمے میں اپنا نام اور اپنے گاؤں کا نام اِس نہج پر لکھا: ''اعظم کریوی، کورئی، الہ آباد، 25 اگست 1928ء''۔

جبکہ اُس وقت اعظم کریوی کی پوسٹنگ ''کوئٹہ'' میں تھی، لیکن پھر بھی اُنھوں نے اپنے نام کے ساتھ ''کوئٹہ'' کی جگہ اپنے چھوٹے سے گاؤں ''کُرئی'' کا نام لکھا جو اُن کے آبائی وطن سے بے لوث محبت اور مثالی لگاؤ کی دلیل ہے۔ اسی طرح اپنے افسانہ 'پریم کی لیلا' میں اپنے وطن کا ذکر اِس طور پر کیا ہے کہ گویا اُن کا گاؤں نہایت ہی مشہور و معروف

گاؤں میں سے ایک ہو، مثلاً: 'کورئی گھاٹ کے پاس گنگا جی کے کنارے الہ آباد کے ضلع میں ایک گاؤں رام چورا ہے۔' یہاں 'کورئی گھاٹ' کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ ''کورئی گھاٹ'' کے بالمقابل ''گنگا جی''، ''الہ آباد'' اور ''رام چورا'' زیادہ مشہور تھا۔ بلکہ صرف اتنا کہہ دینا بھی کافی تھا کہ ''گنگا جی کے کنارے الہ آباد ضلع میں ایک گاؤں رام چورا ہے۔'' لیکن اعظم کریوی نے اپنے غیر معروف گاؤں کو بھی اِس طرح پیش کیا کہ جیسے وہ کوئی مشہورِ عالم گاؤں ہو۔ یہ بھی اپنے گاؤں اور وطن سے اُن کی محبت کی واضح دلیل ہے۔

ملازمت کے سلسلے میں اعظم کریوی ملک کے مختلف گوشوں میں رہے، لیکن جہاں کہیں بھی رہے وطن اور گاؤں کی یاد اُنھیں ستاتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ جب جہاں اُنھیں اظہار کا موقع ملا اپنے گاؤں سے محبت اور وطن دوستی کا مظاہرہ کر بیٹھے۔ خواہ نثر کے توسط سے ہو یا نظم کی توسط سے، مثلاً:

اعظم تمام عمر غریب الوطن رہا
خانہ بدوش ہوں کہیں دنیا میں گھر نہیں

وطن میں عید نہ منا پانے پر اپنے غم کا اظہار کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

ہم تو ہیں پردیش میں اعظم منائیں عید کیا
دید کے قابل مگر اہل وطن کی عید ہے

اعظم کُریوی کے کئی خطوط بھی ایسے ہیں جن سے اُن کی وطن دوستی ظاہر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر 13 دسمبر 1944ء کو اُنھوں نے ایک خط محمد یوسف کمال ناروی کے نام لکھا۔ اُس میں وہ لکھتے ہیں کہ سخت انتظار کے بعد نارہ شریف کا چلا ہوا خط مجھے یہاں ملا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ اب تک وطن کی فضاؤں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ چناں چہ میں بغرض یاد دِہانی خط لکھنے ہی والا تھا کہ آپ کا گرامی نامہ مل گیا۔ بہت خوشی ہوئی۔

پھر 20 اگست 1946ء کو اَنبالہ چھاؤنی سے محمد یوسف کمال ناروی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ آپ کا 17 اگست کا کارڈ ملا۔ آخر آپ ہگلی سے جو پھسلے لب گنگا پہنچے۔ وطن

پہنچ ہی گئے۔ اِس سے بڑھ کر کیا خوشی ہوسکتی ہے۔ والد صاحب بھی فیض آباد آ گئے۔ یہ سب اللہ کا فضل و کرم ہے۔ بنڈیل ہزار رُومانی مقام ہو مگر ''حب وطن از ملک سلیماں خوش تر''۔ اب آپ الہ آباد آ گئے ہیں تو آپ سے ان شاء اللہ جلد جلد ملاقات ہوتی رہے گی۔ یہاں کا موسم خوش گوار ہے، میرے الہ آباد کا کیا حال ہے؟

خلاصہ یہ کہ اپنے وطن سے ایسی محبت کون کرسکتا ہے۔ اعظم کریوی نے یہ نہیں لکھا کہ ''الہ آباد'' کا کیا حال ہے؟ بلکہ یہ لکھا ہے کہ ''میرے الہ آباد'' کا کیا حال ہے؟ الہ آباد کے ساتھ ''میرے'' کا لفظ وجدانی کیفیت کا مظہر ہے۔ لیکن یہ کون جانتا تھا کہ ایک دن وہ بھی آئے گا کہ اعظم کریوی نہ صرف اپنے وطن سے دور ہو جائیں گے بلکہ اپنے گاؤں اور وطن کی گود میں سونے کے بجائے دیارِ غیر میں ایک مہاجر کی طرح دنیا سے رخصت ہوں گے۔

تحریک آزادی: ایک غیور قوم اور سچے ہندوستانی کی طرح اعظم کُریوی بھی آزادی کے حامی اور دلدادہ تھے۔ انگریز اُنھیں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ملازمت میں جو ترقی اُنھیں ملنی چاہیے تھی وہ نہ مل سکی، کیوں کہ اعظم کُریوی دفتر میں بھی انگریزوں اور اُن کے بہی خواہوں کے آداب و تعظیم اُن کی مرضی کے مطابق نہیں کر پاتے تھے، اور کبھی کبھی نوبت تو اِس حد تک پہنچ جاتی تھی کہ اعظم کُریوی انگریز افسروں سے بھڑ بھی جاتے تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود اعظم کُریوی خفیہ طور پر قومی اور ملی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ خود بھی ولایتی سامان سے احتراز کرتے اور دوسروں کو بھی اِس بات کی ترغیب دیتے کہ وہ لوگ بدیسی سامان کے بجائے دیسی سامان استعمال کریں اور بدیسی دکانوں کے بجائے دیسی دکانوں سے چیزیں خریدیں۔ انگریز بیزاری اور آزادی کی خواہش صرف اُن کے قلب کے اندر ہی نہیں تھی بلکہ یہ سب باتیں اُن کی تحریروں اور افسانوں میں بھی باقاعدگی سے نظر آتی ہیں۔ اِس تعلق سے اُن کے افسانے ''انقلاب''، ''کرنی کا پھل'' وغیرہ بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر اعظم کُریوی ویسے تو مطلق انگریز سے نالاں تھے، لیکن بالخصوص اُن کی بدسلوکی اور

ہندوستانیوں کے ساتھ ان کا غیر انسانی رویہ اُنھیں بالکل پسند نہیں تھا۔ ان کے متعدد افسانے ایسے ہیں جن میں اُنھوں نے انگریزوں کی بدسلوکیوں اور اُن کی غیر انسانی حرکتوں کو عوام الناس کے سامنے واضح طور پر پیش کیا ہے۔ چناں چہ اپنے ایک افسانے میں وہ لکھتے ہیں کہ ’’’سرکاری ملازم ہو کر بھی وہ پوشیدہ طور سے ملی اور قومی کاموں میں بہت حصہ لیتے۔ ولایتی دکانوں کے بجائے وہ ہمیشہ دیسی سے سودا سلف خرید تے تھے۔ ونے کرشن ایسے مشہور لیڈر کا درشن کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب آگے بڑھے‘‘۔

انگریزوں کا جو گھٹیا رویہ ہندوستانیوں کے ساتھ جاری تھا اُس پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ’’کلکتہ جانے والی گاڑی پلیٹ فارم کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور وِنے کرشن دوسرے درجے میں بیٹھنے کے لیے بڑھے، جیسے ہی وہ کھڑکی کھول کر کمرے میں داخل ہونے لگے اندر بیٹھے ایک یورپین صاحب بہادر نے ڈانٹ کر کہا: ’’یو، کالا آدمی کی گاڑی نہیں۔‘‘ وِنے کرشن نے کہا: ’’کیوں، میرا روپیہ بھی کالا ہے؟ میرے پاس سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ ہے۔‘‘

ایک تو حکم نہ ماننا اور دوسرے گستاخانہ جواب ایک کالے آدمی کی طرف سے سفید چمڑے والا نہ سہن کر سکا۔ اُٹھا اور دھوتی قمیص ریشمی چادر اوڑھنے والے سوراجی لیڈر کو پلیٹ فارم پر دھکیل دیا، اور اِس کے ری ایکشن میں اسٹیشن پر اُس انگریز کی جو درگت بنی اُس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: جو والنٹیئر اور قوم پرست لوگ وِنے کرشن کو پہنچانے آئے تھے وہ سب اُن کی بےعزتی ہوتے دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئے۔ والنٹیئر وں نے وندے ماترم کا نعرہ لگایا اور دو تین آدمی کمرے میں گھس کر صاحب بہادر کو باہر کھینچ لائے اور چاروں طرف سے بے بھاؤ کے پڑنے لگے۔ شور و غل سن کر اِس طرف گارڈ آ رہا تھا وہ صاحب بہادر کی گت دیکھ کر چپ چاپ بریک وان میں گھس گیا، بڑی مشکل سے سمجھ دار لوگوں نے صاحب بہادر کو بچالیا۔‘‘

یہ تمام مناظر دراصل اعظم کریوی کی آزادی کی حمایت اور انگریز سے نفرت کو بیان کرتے ہیں۔ مذکورہ افسانے میں اعظم کریوی نے اپنے دلی جذبات اور چشم دید حال پیش

کیا ہے کہ کس طرح قومی وملی پروگرام میں وہ چھپ چھپا کر حصہ لیتے، مجاہدین آزادی سے ملاقات کرتے (جیسا کہ ونے کرشن سے ملاقات کی) اور اِس طرح ملازمت میں رہتے ہوئے ملکی وملی مفاد کے لیے سرگرم عمل رہے۔

مصادر و مآخذ:

ماہنامہ اخبار اعظم، کراچی، اعظم کریوی نمبر، جون و جولائی، 1990ء، ص:62

اردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ، باب:2، فصل:4 (قلمی نسخہ)

ماہنامہ اخبار اعظم، اعظم نمبر، جون- جولائی، 1990ء، ص:62

میرا پسندیدہ افسانہ، ص:105، مصنفہ بشیر ہندی بحوالہ اخبار اعظم، کراچی

ماہنامہ اخبار اعظم، اعظم نمبر، جون- جولائی، 1990ء، ص:62

میرا پسندیدہ افسانہ، ص:106، مصنفہ بشیر ہندی بحوالہ اخبار اعظم، کراچی، 1990ء

اُردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ، باب:2، فصل:4 (قلمی نسخہ)

ماہنامہ اخبار اعظم، اعظم کریوی نمبر، جون- جولائی، 1990ء

اُردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ، باب:2، فصل:4 (قلمی نسخہ)

ماہنامہ نیرنگ خیال، سالنامہ نمبر، دسمبر 1934ء، ص:30

اُردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ، باب:2، فصل:4 (قلمی نسخہ)

ماہنامہ ساقی کراچی، نومبر، 1955ء، ص:32-31

اردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ، باب:۲، فصل:۴ (قلمی نسخہ)

ماہنامہ ساقی کراچی، نومبر، ۱۹۵۵ء، ص:۱۳-۲۳

اردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ، باب:2، فصل:4 (قلمی نسخہ)

ماہنامہ ساقی کراچی، نومبر، 1955ء، ص:32

ماہنامہ ساقی کراچی، نومبر، 1955ء، ص:33

اردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ، باب:2، فصل:4 (قلمی نسخہ)

ماہنامہ ساقی کراچی، نومبر، 1955ء، ص:32

حوالہ سابق، ص:34

حوالہ سابق، ص:12

حوالہ سابق، ص:34

حوالہ سابق، ص:33، حوالہ سابق، ص:12

اردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ، باب:2، فصل:4 (قلمی نسخہ)

ماہنامہ اخبار اعظم، کراچی، جون-جولائی، 1990ء، ص:26

روزنامہ زمیندار، لاہور، 27 جون 1955ء

اردو افسانے کی تشکیلی روایت میں ڈاکٹر اعظم کریوی کا حصہ، ص:321-320

افسانہ ''کرنی کا پھل''

❖❖❖

Dr. Jahangir Hasan
Shah Safi Academy,
Jamia Arfia Syed Sarawan
Distt. Koshambi (UP) 212213
Mob. 9910865854

تخلیق کاروں سے گزارش

- سہ ماہی ''اکادمی'' کے لئے معیاری نگارشات ہی ارسال کریں۔ ہر تخلیق پر غیر مطبوعہ کی تصدیق ہونا لازمی ہے۔ ساتھ ہی مکمل ایڈریس، موبائل نمبر بھیجیں۔
- ای۔میل سے بھیجی ہوئی نگارشات کا پروف اچھی طرح پڑھ لیں، اِن پیج فائل کے ساتھ پی ڈی ایف بھی بھیجیں۔
- تخلیقات کے ساتھ بینک اکاؤنٹ میں درج نام، بینک کا نام، شاخ کا نام، آئی۔ایف۔ایس۔سی نمبر انگریزی میں لکھ کر بھیجنا ضروری ہے، پاس بک کی فوٹو کاپی یا کینسل چیک بھی منسلک کرنے کی زحمت کریں۔

Vol.-22 Issue No. 4 April - June 2025
उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी पत्रिका
اُتر پردیش اردو اکادمی مجلہ

اُتر پردیش اُردو اکادمی کی نئی کتابیں

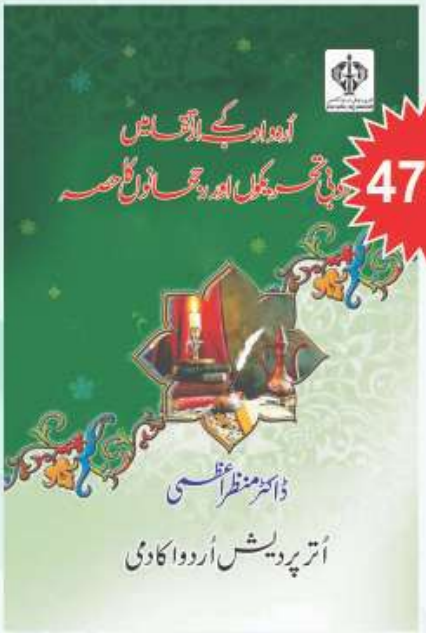

475/-

603/-

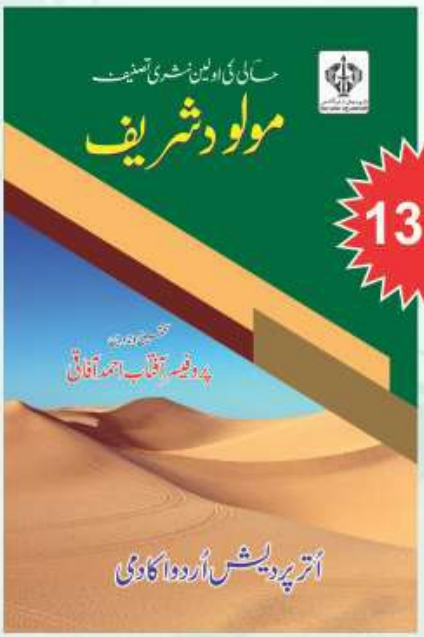

131/-

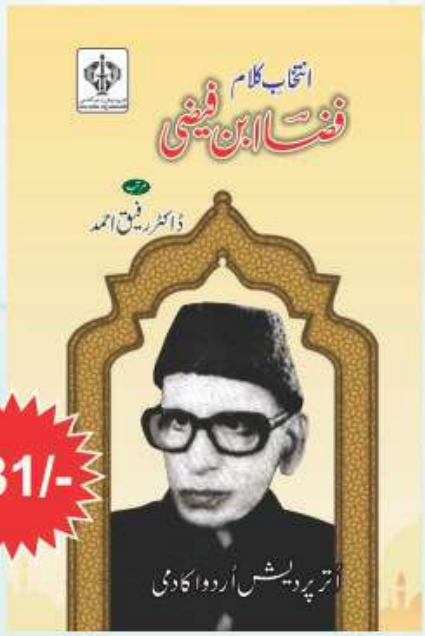

131/-

رابطہ کریں
سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ گومتی نگر، لکھنؤ-226010
سیل ڈپو : 0522-4022924